جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

ترجمان القرآن
علامہ حمید الدین فراہیؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

”جو سورتیں اپنی قامت کے اعتبار سے جتنی ہی چھوٹی ہیں، معنی کے اعتبار سے اتنی ہی بڑی ہیں۔ ان کے چھوٹے سے حجم کے اندر اسرار حکمت کے اتنے خزانے بند ہیں کہ اگر وہ کھول دیے جائیں تو دفاتر کے اندر بھی نہ سمائیں۔...

☆ دین کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اصول ہمیشہ ذہنوں کے سامنے مستحضر رہیں۔ یہ چیز چاہتی ہے کہ ان اصولوں کو نہایت مختصر اور جچے تلے الفاظ میں گرہ کیا جائے کہ وہ امثال کی طرح زبان پر چڑھ جائیں تاکہ ذہن و دماغ کے لیے وہ جتنے ہی بھاری اور وزنی ہوں زبان کے لیے اتنے ہی ہلکے پھلکے ہوں۔ اس طرح کی باتوں کو اگر طویل عبارتوں میں بیان کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ ان کے پھیلاؤ کے اندر گم ہو کے رہ جائیں۔

☆ ...عموماً کسی تعلیم و دعوت کی ابتدا میں اس کے لیے لوگوں کے دل اچھی طرح نہیں کھلتے جس کے سبب سے نہ تو تفصیلات کلام کے لیے ان کے اندر گنجائش ہوتی ہے نہ جزئیات احکام کے لیے۔ اس وجہ سے ابتدا میں لوگوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے وہ جوامع الکلم یعنی چھوٹے چھوٹے پر حکمت فقروں اور جملوں میں دی جاتی ہے۔ جوامع الکلم کے یہ بیج جب پھوٹتے ہیں تو تفصیلات سے ان کی آبیاری کی جاتی ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ دل کی وسعت اور اس کے علم دونوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

☆ ...چونکہ دین کامل کو باقی رکھنا مقصود تھا اس لیے جامع و کلی اصولِ دین کو غایت درجہ اختصار اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا تاکہ امت کا ہر فرد بتمام و کمال قرآن شریف کو حفظ کرنے پر قادر نہ ہو سکے تو اس کو یہ چھوٹی چھوٹی سورتوں کو حفظ کرنا مشکل نہ محسوس ہو۔ اس لیے تم دیکھو گے کہ یہ چھوٹی چھوٹی سورتیں مشتمل بھی ایک ہی مخصوص مضمون پر ہیں؛ سورہ اخلاص توحید کی سورہ ہے... سورہ العصر دین کی دو بنیادوں 'ایمان اور اعمالِ صالحہ' پر اور سورہ الکوثر بشارت کے مضمون پر مشتمل ہے... اس حقیقت کے پیش نظر ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کو حفظ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان میں سے بعض کا ایک تہائی قرآن اور بعض کا نصف قرآن کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔[٦]“ (حمید الدین فراہی)

حمید الدین فراہی

پیدائش اور تعلیم: حمید الدین فراہی نے 18 نومبر 1862 کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں 'پھریہا' کے ایک معزز اور علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ دس برس کی عمر میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ پھر فارسی سیکھی اور اس پر عبور حاصل کیا۔ اس حد تک کہ بالکل اساتذہ کے رنگ میں اشعار کہنے لگے۔ اس کے بعد عربی زبان وادب کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے ماموں زاد بھائی علامہ شبلی نعمانی سے کسب فیض کیا۔ علامہ شبلی کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی کی عالمانہ صحبت بھی میسر آئی۔ رات کو جلدی سونا اور صبح ڈھائی تین بجے اٹھ کر تہجد کے اہتمام کی عادت انھوں نے بچپن میں ہی ڈال لی تھی۔ علم کی لگن انھیں لکھنؤ لے گئی جہاں مولانا عبدالحئی فرنگی محلی سے فقہ اسلامی کے میدان میں استفادہ کیا۔ پھر لاہور گئے اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

1883 میں عربی ادب کی درسیات کی تکمیل سے فارغ ہو کر علامہ بیس سال کی عمر میں انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ پہلے مڈل اور انٹرنس پاس کیا پھر 1891 میں ایم اے او کالج، علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے انگریزی زبان کے علاوہ جدید فلسفے پر خصوصی توجہ دی۔ 1895 میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ایم اے اور ایل ایل بی کرنے کا ارادہ تھا لیکن بوجوہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

علامہ فراہی ایک انتہائی زیرک، ذہین وفطین طالب علم تھے۔ علی گڑھ میں ان کے داخلے کے لیے سرسید نے انگریز پرنسپل کے نام ایک تعارفی خط لکھا تھا جس میں فراہی کو عربی اور فارسی کے مضامین سے مستثنیٰ رکھنے کی سفارش کرتے ہوئے بطور دلیل کہا تھا کہ طلبہ تو دور اساتذہ تک عربی وفارسی میں اس طالب علم کی ٹکر کے کم نکلیں گے۔ سرسید کے کہنے پر فراہی نے طبقات ابن سعد سے سیرت نبوی کا کچھ حصہ

فارسی میں ترجمہ کیا تھا جو اس قدر معیاری تھا کہ اسے شامل نصاب کرلیا گیا۔امام غزالی کے ایک قلمی نسخے کو ایڈٹ اور تصحیح کرنے کا کام جو سرسید، شبلی اور حالی جیسے اساطین سے نہ ہوسکا وہ ان بزرگوں نے انھیں سونپ دیا، اور اس ذمہ داری سے بھی وہ کماحقہ عہدہ برآ ہوئے۔

عملی زندگی: تعلیم سے فراغت کے بعد 1897 میں مولانا فراہی مدرسۃ الاسلام کراچی میں عربی کے استاذ مقرر ہوئے۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن کے سفرِ عرب کے دوران علامہ شبلی کی ضد پر فراہی نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے، یوں ایک انگریز وائسرائے کے ساتھ 'تعاون' کا عمر بھر انھیں ملال رہا۔فروری 1907 میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر (عربی) کے ان کا تقرر ہوا۔اسی سال علی گڑھ میں انجمنِ مترجمین کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد انگریزی کی بلند پایہ علمی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا تھا۔علامہ فراہی اس منصوبے کے مشترک ایڈیٹر بنائے گئے۔ترجمہ کی تصحیح کے علاوہ ان کے ذمے یہ کام بھی تھا کہ وہ ایک ایسی لغت تیار کریں جس میں انگریزی زبان کی علمی اصطلاحات کی اردو میں تشریح ہو اور ان اصطلاحات کا اردو متبادل بھی پیش کیا گیا ہو۔قیامِ علی گڑھ کے دوران ہی علامہ نے مشہور جرمن مستشرق جوزف ہارویز سے عبرانی زبان سیکھی۔ 1908 میں آپ الہ آباد منتقل ہوئے اور وہاں کے میور کالج میں 1914 تک عربی کے پروفیسر رہے۔ اس کے بعد دارالعلوم حیدرآباد کے پرنسپل کے طور پر آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جون 1914 میں آپ حیدرآباد منتقل ہوئے جہاں 1919 تک آپ نے خدمات انجام دیں۔اس دوران کئی اصلاحات کا نفاذ کیا۔سائنس کی تعلیم جدید نہج پر شروع کرائی، دارالعلوم کو ترقی دے کر یونیورسٹی بنانے کی تجویز زیرغور تھی، علامہ فراہی نے ایک ایسی مشرقی یونیورسٹی کا تفصیلی خاکہ تیار کیا جس میں دینی وعصری مضامین کے لیے اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔ریاست کا تعلیمی بورڈ اس منصوبے کا قائل ہوگیا اور علامہ فراہی کا یہ خواب جامعہ عثمانیہ کی شکل میں شرمندہ تعبیر ہوا۔علامہ میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی لہٰذا قیام حیدرآباد کے دوران بھی نظام اور نوابوں سے کوئی سروکار نہ رکھا اور اپنے علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہے۔

اگست 1919 میں حیدرآباد سے مستعفی ہوکر آپ اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے۔ یوں تو وہ ہمیشہ سے مدرسۃ الاصلاح اور دار المصنفین سے متعلق تھے لیکن اب جو فرصت پائی تو ان پر پوری توجہ

مرکوز کی۔ 1916 میں ہی انھیں باقاعدہ مدرسے کا ناظم منتخب کرلیا گیا تھا، اب انھیں وہیں رہ کر اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے کا موقع ملا۔ علامہ نے مدرسے کے نصاب تعلیم میں قرآن کو مرکزی حیثیت دی، اور دیگر تمام علوم کو بمثل سیارہ اس آفتاب کے گرد گھما دیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے علم و ہنر، تدبر و تفکر بلکہ تقویٰ وللّٰہیت سے بھی طلبہ واساتذہ کو'ڈوب کر قرآن میں پا جا سراغ زندگی' کے قالب میں ڈھال دیا۔ قرآن میں تدبر و تفکر کے لیے ان کی روح کو پیاسا کردیا۔ 1927 میں فریضۂ حج ادا کیا۔ ان کی صحت خاصی اچھی تھی لیکن دردِ سر اور پیشاب رک جانے کی شکایت تھی۔ اسی موخرالذکر تکلیف کے عود کر آنے پر آپریشن کے لیے علامہ فراہی متھرا گئے۔ اللہ کی مشیت ایسی کہ آپریشن ناکام رہا اور 11 نومبر 1930 کو علامہ فراہی اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اعلی علیین میں انبیاء، شہداء و صالحین کی معیت نصیب فرمائے۔ قرآن پر تدبر و تفکر کی جوئی مشعل فراہی نے جلائی تھی وہ ان کی زندگی کے ساتھ بجھ نہ گئی بلکہ چراغ سے چراغ جلتے رہے۔ علامہ نے ایسے طلبہ چھوڑے، جن کی خصوصی تربیت ونگہداشت انھوں نے کی تھی اور جن کے ذمہ ان کے نامکمل کاموں کی تکمیل اور ان کے نقش قدم پر آگے بڑھنے کی ذمہ داری تھی۔ ان شاگردوں میں مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا امین احسن اصلاحی کا نام قابل ذکر ہے۔

علمی خدمات: علامہ فراہی عام معنوں میں ایک کثیر التصانیف مصنف نہ تھے۔ وہ لکھنے سے زیادہ غور وفکر میں منہمک رہتے، دوران مطالعہ تنقیدی نوٹ لکھتے جاتے۔ مختلف موضوعات پر بیک وقت غور کرتے اور جس موضوع کے تعلق سے کوئی بات سوجھ جاتی اسے ایک پرزے پر علاحدہ لکھ دیتے۔ انہی نوٹس کے مکمل ہونے پر انھیں کتابی شکل دے دیتے۔ شاید یہی وجہ رہی کہ اسی طرح کے نوٹس پر مشتمل ناتمام کتابوں کا ایک قیمتی ذخیرہ انھوں نے چھوڑا ہے۔ نظمِ قرآن کے نظریے کو علامہ فراہی نے اپنے مطالعے اور قوت فکر سے ایک ٹھوس شکل دی۔ انھوں نے زور دیا کہ قرآن میں کوئی لفظ بھی زائد نہیں ہے اور پورا قرآن شروع سے آخر تک مربوط ہے، اس میں جو'بے ربطی' بھی نظر آتی ہے وہ قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ ہر آیت اپنی اگلی اور پچھلی آیت سے انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہے؛ ہر سورہ کا ایک مرکزی مضمون (عمود) ہوتا ہے اور جو ذیلی مباحث ہوتے ہیں، وہ بھی اسی عمود سے متعلق ہوتے ہیں، ہر سورہ اپنی اگلی اور پچھلی سورہ سے بہ اعتبار مضمون ربط رکھتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان نظریات

کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ فراہی نے تفسیر نظام القرآن لکھی جس میں چند مخصوص سورتوں کی تفسیر کی گئی ہے۔ تفسیر کے مقدمہ میں نظم قرآن سے متعلق اپنے نظریات کو انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ مفردات القرآن (قرآن کے مشکل الفاظ کی تحقیق)، الامعان فی الاقسام القرآن (قرآن میں اللہ نے جو قسمیں کھائی ہیں ان کا بیان)، ذبیح کون ہے؟، جمھرۃ البلاغہ (عربی زبان میں بلاغت کے اصولوں پر تنقید و تفہیم)، دلائل النظام، اسالیب القرآن، اصول التاویل، فی ملکوت اللہ، عروج و زوال کی اساس، اسلامی سیاست جیسے اچھوتے موضوعات پر قلم اٹھایا۔

آج بھی متعدد کتب اور قرآن کریم پر علامہ فراہی کے حواشی تخریج و تحقیق کے محتاج غیر مطبوعہ پڑے ہیں۔ ان کے متعدد نوٹس، جن میں قرآن میں تدبر کی نہ جانے کون کون سی کلیدیں ہیں، بے التفاتی کے شاکی ہیں۔ اگر روایتی تفاسیر کے ڈھیر میں اضافہ کرنے والے مفسرین اس 'ترجمان القرآن' کی کاوشوں کو مربوط کر کے دنیا کے سامنے لے آئیں تو شاید یہ قرآن کی بہتر خدمت ہوگی۔